سورۃالجن

۲۸ آیات ہیں اور مکی ہے ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوئی۔ حضرت عائشہؓ اور ابن زبیرؓ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ اور اس سورۃ کا نام قل اوحی بھی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) **قُلْ** (ترجمہ:۔ آپ فرمادیجئے) اے محمد ﷺ لوگوں کو **اُوْحِیَ اِلَیَّ** (ترجمہ:۔ میری طرف وحی کی گئی) ایحاء کے معنی ہیں ''اخبار'' اور اسی طرح وحی کے معنی بھی یہی ہیں۔ اوحی الیہ یعنی اس نے انہیں الہام فرمایا۔ اس طرح اوحی ربک الی النحل کے معنی بھی یہی ہے۔ یہ کبھی کبھی ل کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بان ربک اوحی لھا. (الزلزال ۵) اس کے معنی ہیں کہ اس نے اس کو حکم دیا۔ اور ''وحی'' اس معنوں میں آتا ہے۔ جیسا کہ زجاج کا قول ہے۔

وحی لھا القرار' فاستقرت وشد ھا بالراسیات الثبت

اور وحی وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی طرف الہام فرماتا ہے۔ ابن الانباری کہتے ہیں کہ وحی اس لئے کہا جاتا ہے کہ فرشتہ اس کو مخلوق پر مخفی رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ نبی ﷺ مخصوص ہیں۔ جن کی طرف (جبرئیلؑ) کو مبعوث کیا جاتا ہے۔ زجاج کہتا ہے کہ وحی کے معنی الہام کے ہیں۔ اور ازہری کہتا ہے کہ وحی کے معنی القاء کے ہیں۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ یہ دونوں معنی جبرئیلؑ کے ذریعہ سے ''ایحاء'' کو شامل نہیں ہیں۔ وہ تو صرف اسے شامل ہیں جو انبیاءؑ کو ان کے قلوب میں القاء کے طور پر سکھایا جاتا ہے۔ اور ابو اسحاق کہتے ہیں لغت میں وحی کے اصل معنی ہیں مخفی طور پر پیغام پہونچانا۔ اسی طرف اللہ نے ارشاد فرمایا ہے ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب (الشوری ۵۱)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سوائے اس کے کہ وہ اس کی طرف مخفی طور پر پیغام رسانی کرے پھر اسے وہ کچھ سکھائے جو بشر کو سکھاتا ہے۔ بے شک اس نے الہام کے ذریعہ یا رویا کے ذریعہ سکھایا یا اس پر کتاب کو نازل کیا جیسے اس نے موسیٰ پر کتاب نازل کی یا اس پر قرآن کو نازل کرے جیسا کہ سیدنا محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔ یہ تمام صورتیں اعلام کی ہیں۔ اور آخری دونوں قسموں کو بالواسطہ وحی کہا جاتا ہے۔ **اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ** (ترجمہ:۔ جنوں کی ایک جماعت نے غور سے سنا) انہ زبر کے ساتھ ہے کیونکہ یہ اوحی کا فاعل ہے۔ اور اس میں ضمیر شان کی ہے۔ اور استمع کا مفعول محذوف ہے اور وہ ہے القرآن۔ نفر کا اطلاق تین سے دس تک ہوتا ہے۔ فلاسفہ کے درمیان جنوں کے وجود کے بارے میں اختلاف ہے وہ اس کے خارجی وجود کا انکار کرتے ہیں۔ شیخ الرئیس ابن سینا کہتے ہیں کہ جن ہوائی حیوان ہے جو مختلف اشکال میں متشکل ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ یہ نام کی تشریح ہے اور یہ انہوں نے اس لئے کہا ہے کہ وہ جنات کے خارجی وجود کا اعتراف نہیں کرتے۔ اور قدیم فلاسفہ میں اکثر لوگ ان کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں خاص طور پر اصحاب روحانیات' اور وہ انہیں ارواح سفلیہ کا نام دیتے ہیں۔ اور اسی طرح دیگر مذاہب

کے لوگوں نے بھی ان کے وجود کا اعتراف کیا ہے جبکہ وہ انبیاء کے پیروکار ہیں۔اس طرح امام رازی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ان کے وجود کا اعتراف حکمائے ہند وفارس نے بھی کیا ہے۔شیخ الاکبر ابن عربی فرماتے ہیں کہ جنات مارجیہ ارواح ہیں اس لئے کہ اللہ کا فرمان ہے۔ وخلق الجان من مارج من نار ۔(الرحمٰن ۱۵) انہیں لوگ نہیں دیکھ سکتے ہیں کیونکہ وہ لطیف شفاف ارواح ہیں انہیں زمین کی کدورت نہیں ہے وہ گویا کہ آسمان کی طرح ہیں۔کہ انہیں لوگ نہیں دیکھ سکتے۔کیونکہ لطیف وشفاف ہیں اور مواد عنصریہ میں ہوا کی طرح ہیں۔باوجودیکہ وہ آسمان وزمین کے درمیان ہوتی ہے اسے کوئی دیکھ نہیں پاتا۔اور دیگر عناصر کی طرح ہیں جن کا ادارک یورپ کے عقلاء نے کیا ہے۔مثلاً آکسیجن اور ہائیڈروجن۔پس یہ چیزیں وجود خارجی کے ساتھ موجود ہیں۔تاہم متعلقہ آلات کے بغیر ان کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔پس اسی طرح جنات بھی ہیں جن کا حواس کے ذریعہ ادراک نہیں کیا جاسکتا سوائے ان کے متعلق آلات کے ذریعہ اور وہ ہیں عزائم اور اوراد وریاضت کے ذریعہ نفس کے تزکیہ تحلیہ کے بعد۔امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ ذوات ماہیت کے اعتبار سے مختلف انواع ہیں جیسے کہ ماھیات اعراض مختلف ہوتی ہیں اور اس لئے کہ وہ محل کی محتاجی میں یکساں ہوتی ہیں پس ان کے بعض تو خیر ہوتے ہیں اور بعض شریر۔اور بعض بڑے کریم بھی ہیں۔خیرات کو چاہنے والے اور بعض انتہائی گھٹیا خسیس اور شر وآفات کو چاہنے والے ہوتے ہیں ان کی انواع واصناف کی تعداد کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔میں کہتا ہوں کہ (قول مفسر علامؒ) ان میں سے بعض کا صاحب خیر اور بعض کا صاحب شر اور بعض کا کریم اور بعض کا دنّی ہونا ان کے مختلف انواع ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔جیسا کہ بعض انسانوں کا نیک اور بعض کا شریر ہونا ان کے انواع کے مختلف ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔بلکہ خیر وشریر کریم ولئیم وغیرہ نوع انسان کے افراد ہیں اسی طرح سے بعض جنات میں سے خیر اور شریر کریم اور لئیم نوع جن کے افراد ہیں پس وہ بھی ایک ہی نوع ہیں جیسے کہ نوع انسانی۔ان عوارض کا مختلف ہونا ان کے مختلف انواع ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔یہ فلاسفہ اور جمہور متکلمین کا نظریہ ہے برخلاف بعض متکلمین کے اور ان میں سے ایک امام رازی بھی ہیں۔ان کا نظریہ یہ ہے کہ نفوس ناطقہ مختلف ہیں۔اور امام رازی نے بھی اس پر قیاس کیا ہے اور کہتے ہیں کہ جنات کی ذوات بھی نوع کے اعتبار سے مختلف ہیں حالانکہ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ افعال نفسانیہ مثلاً کرم ولئوم کا مختلف ہونا۔مزاج کی جودت ورداءۃ کی طرف مسند ہوتا ہے جیسا کہ جمہور حکماء کا نظریہ ہے۔مقصد یہ ہے کہ جمہور حکماء اور متکلمین کے نزدیک نفس ماھیت ہے۔جنات کو تشبیہ دی۔ان میں امام رازی بھی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اپنی ذات سے قائم ہونے والے جواہر یا تو مادہ سے متعلق ہیں یا مادہ سے متعلق نہیں ہیں۔جہاں تک دوسری قسم کا تعلق ہے تو وہ نفوس مجردہ ہوتے ہیں جنہیں شرعی زبان میں ملائکہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اور اگر پہلی صورت ہے تو اس میں بھی دو صورتیں ہوں گی۔یا تو مادہ فلکیہ ہوگا یا پھر مادہ عنصریہ ہوگا اگر پہلی قسم ہے تو اسی کو نفوس فلکیہ کو کبیہ کہا جاتا ہے۔اور اگر دوسری صورت ہے تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے۔یا تو وہ مادیہ عنصریہ سفلیہ کثیفہ ہوگا یا مادیہ عنصریہ علویہ خفیفہ ہوگا جیسے کہ آگ اور ہوا۔اور اگر وہ دوسری قسم ہے تو وہ جنات ہے۔اور جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے تو وہ بھی اس بات سے خالی نہیں کہ وہ مادہ فقط نشو کو قبول کرنے والا ہوگا نشو وحرکت اور شعور کو بھی قبول کرنے والا ہے۔پس اس میں سے پہلی قسم نفس نباتیہ اور دوسری قسم نفس حیوانیہ ہے۔

اس مسئلہ پر ہم اس تفسیر کی پہلی جلد میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ پھر نقلی دلائل بھی جنات وشیاطین کے وجود پر دلالت کرتے ہیں ان میں سے ایک قول باری تعالیٰ ہے والجان خلقناه من قبل من نار السموم (الحجر ۲۷) اور دوسری دلیل اللہ کا فرمان ہے۔ وخلق الجان من مارج من نار (الرحمن ۱۵) اور تیسری دلیل اللہ کا ارشاد گرامی ہے۔ وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون (الذاريات ۵۶) اور چوتھی دلیل اللہ کا یہ خطاب کر کے یہ فرمانا ہے یا معشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموات والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان (الرحمن ۳۳) اور پانچویں دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے یا معشر الجن والانس الم ياتكم رسل منكم (الانعام ۱۳۰) اور چھٹی دلیل اللہ کا قول ہے يوسوس في صدور الناس من الجنة والناس۔ (الناس ۶) اس کے علاوہ دیگر آیات وصحیح احادیث ابلیس کے وجود پر اور اس کے آگ سے خلق ہونے اور نوع جن کے کثیر ہونے پر دلالت کرتی ہیں جیسے کہ اللہ نے فرمایا۔ خلقتني من نار وخلقته من طين (الاعراف ۱۲) اور اللہ کا یہ فرمانا کہ الا ابليس كان من الجن۔ ظاہر ہے کہ اللہ خلقت الجن والانس ارشاد فرمانا 'جن' کے وجود کو لازم کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ انس کے وجود کو لازم کرتا ہے۔ اسی طرح خطاب بھی مخاطب کے وجود کو لازم کرتا ہے۔ ورنہ محال لازم آئے گا اور وہ باری تعالیٰ کا کذب ہوگا (نعوذ باللہ) ان آیات سے شیاطین وجنات کے وجود کا قطعی علم ثابت ہوگیا۔ اور ان نصوص قطعیہ کی بغیر کسی معقول اور واضح وجہ کے تاویل بھی درست نہیں ہے۔ پس معتزلہ اور ان کے متبعین کا شیاطین وجنات کے وجود کا انکار کا جو نظریہ وہ ان واضح نصوص کے خلاف ہے۔ اور نصوص کا رد کرنا کفر ہے۔ پس ان نصوص کا رد بھی کفر ہی ہے۔ موجودہ زمانہ کے بعض معتزلین میں سے ایک شخص مسمی سید احمد نے اپنی تفسیر میں اس عقیدہ پر اصرار کیا ہے اور کہا ہے کہ جنات وشیاطین کا وجود باطل وہم اور طبیعت کے افتراء کا خیال ہے۔ اور قرآن ان کے وجود پر دلالت نہیں کرتا۔ اور ان کے وجود سے اللہ کی مراد بدوی انسانی ہے جو کہ پہاڑوں' ویران مکانوں اور غاروں میں چھپا رہتا ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ شیاطین اور جنات کے وجود کے امتناع پر دلالت کرنے والی کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے سوائے باطل تحکم کے۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ جب آپ کتب لغت کا تتبع کریں گے تو آپ اس میں جن کے معنی یہ پائیں گے الشئی يجنه جناً یعنی اسے چھپایا۔ اور حدیث میں ہے جن عليه اليل۔ اس کے معنی ہیں کہ رات نے اسے چھپالیا۔ اور وہی اس کے حقیقی معنی ہیں۔ اور اسی سے جنین اور جنت ہیں کیونکہ اور دونوں چھپے ہوئے ہیں اور یہ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلا یہ کہ ابن سیدہ کہتے ہیں کہ یہ عالم کی نوع ہے انہیں جن اس لئے کہا گیا ہے کہ آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اور اس لئے کہ وہ لوگوں سے چھپتے ہیں پس وہ دیکھے نہیں جاتے۔ جنان اس کی جمع ہے۔ اور وہ جنات ہی ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں الجنة معنی جنوں کے ہیں جیسا کہ آیت ام به جنة (سبا ۸) یعنی جنوں۔ اور تیسرے معنی ہیں الجن ' الجان سانپ کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔ تهتز كانها جآن۔ (النمل ۱۰) ابو عمرو بصری کہتے ہیں کہ جان کے معنی ہیں سانپ۔ زجاج کہتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ لاٹھی حرکت کرنے لگی جس طرح سانپ ہلکی حرکت کرتا ہے۔ چوتھے معنی ہیں جن بمعنی انسانی شیطان۔ اور اس کے یہ معنی اس وقت لئے جاتے ہیں جب یہ لفظ کسی دوسرے اسم کی طرف مضاف

ہو۔ جیسے زید بن مقبل کی حدیث میں مذکور ہے۔ جنان الجبال یعنی وہ لوگ جو وادی بدی کے جنات اور انسانی شیطانوں میں سے فساد کا حکم دیتے ہیں۔ اور یہ جن البدی ایسا فسادی ہے جس کی جائے پناہ یا رہائش بدی کی وادی میں ہے۔ اور بدی وادی کا نام ہے۔ اور جب لفظ جن کو مطلق یعنی بلا اضافت وصفت ذکر کیا جائے تو اس سے مراد مفسد انسان نہیں ہوتا۔ اور اگر اس لفظ سے مراد مفسد انسان یا ایسا شخص جو پہاڑوں اور غاروں میں رہتا ہو جیسا کہ سید احمد نے کہا ہے تو اس صورت میں ''الانس'' کا ''الجن'' پر عطف درست نہ ہوگا۔ آیات من الجنة والناس اور وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون میں۔ اور یہ شخص جب کلام عربی کے اسالیب کو جان نہ سکا تو اس نے جذع بن السنان الغسانی کے اشعار سے جنات کے وجود کی نفی پر استدلال کر دیا۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ جب یہ لفظ وصف واضافت سے مقید نہیں ہوتا تو اس سے نوعِ جن ہی مراد لیا جاتا ہے۔ پس ہمارے اس بیان سے جنات کا وجود عقلی ونقلی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ **فَقَالُوْٓا** (ترجمہ:۔ تو انہوں نے کہا) اپنی قوم سے جب وہ لوٹ کر گئے ان کی طرف **اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا** (ترجمہ:۔ بے شک ہم نے ایک قرآن سنا ہے) یعنی پڑھا ہوا کلام **عَجَبًا** (ترجمہ:۔ عجیب) یعنی نرالا یہاں حذف مضاف ہے۔ یعنی اپنی فصاحت وبلاغت' لطافتِ معانی بہترین بیان اور حسنِ وعظ وامثال اور احکام وشرائع کی وضاحت کے اعتبار سے عجیب۔

(۲) **يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ** (ترجمہ:۔ جو ہدایت کرتا ہے سیدھی راہ کی طرف) یعنی حق وصواب کی طرف **فَاٰمَنَّا بِهٖ** (ترجمہ:۔ ہم اس پر ایمان لے آئے) یعنی ہم نے تصدیق کی کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے **وَلَنْ نُّشْرِكَ** (ترجمہ:۔ اور ہم ہرگز شریک نہیں ٹھیرائیں گے) اس کے بعد **بِرَبِّنَآ اَحَدًا** (ترجمہ:۔ اپنے رب کا کسی ایک کو) اور یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ وہ مشرکوں میں سے تھے۔ یعنی (جنات)

(۳) **وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا** (ترجمہ:۔ اور یہ کہ ہمارے رب کی بزرگی بہت بلند ہے) انہ کو زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور اسی طرح اس کے بعد والی آیت میں بھی کیونکہ یہ آمنا کے قول کے بعد واقع ہوا ہے۔ فراء نے اسی طرح کہا ہے۔ نیز اسے تمام مواقع پر زیر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور ابو حاتم اور ابو عبیدہ نے زیر کی قراءت کو پسند کیا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ''جد'' کے معنی ہیں بزرگی' عظمت اور امر وقدرت اور ابو عبیدہ اور اخفش کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ملک وسلطنت اور مجاہد کہتے ہیں اس کی بے نیازی اور عکرمہ نے جدّ تنوین کے ساتھ اور ربنا کو مرفوع الباء پڑھا ہے اس کے معنی ہیں عظیم۔ هو ربنا ۔ اور حمید بن قیس نے لفظ جد جیم کے پیش کے ساتھ بطور مضاف پڑھا ہے۔ اس کے معنی ہیں عظیم۔ اسے سیبویہ نے حکایت کیا ہے اور یہ قراءت صفت کی موصوف کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔ معنی ہیں تعالیٰ ربنا العظيم۔ اور عکرمہ نے جداً ربنا پڑھا ہے تمیز کے طور پر منصوب کرتے ہوئے۔ اور قتادہ نے جدا ربنا پڑھا ہے۔ جیم کی کسر کے ساتھ حالت نصب پر حال کی وجہ سے۔ حالانکہ تمام قرائتیں شاذ ہیں۔ **مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا** (ترجمہ:۔ نہ اس لئے اپنی کوئی جیسی بنائی اور نہ اولاد) زجاج کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رب کی عظمت وجلال' بیوی یا بیٹا بنانے سے بلند ہے۔

(۴) وَاَنَّهٗ كَا نَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا (ترجمہ:۔اور یہ کہ ہمارا احمق ہی کہتا تھا) یعنی ہمارے میں سے جاہل۔کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ابلیس ہے۔عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (ترجمہ:۔اللہ پر حد سے گزری باتیں) یعنی کذب میں غلو اور حد سے تجاوز کرنا۔اعشٰی کا شعر ہے۔

اینتهون ولن ينهى ذو واشطط كالطعن يذهب فيه الزيت والفتل

مجاہد، ابن جریج اور قتادہ کہتے ہیں جنات کے اس قول میں لفظ سفیه سے مراد ابلیس ہے۔اور ابو موسیٰ اشعری سے بھی مرفوعاً مفعول ہے۔

(۵) وَّاَنَّاظَنَنَّااَنْ لَنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (ترجمہ:۔اور یہ کہ ہم گمان کرتے تھے کہ انسان اور جن اللہ پر ہرگز جھوٹ نہیں باندھیں گے۔) یعنی قرآن کی ہماری تصدیق سے پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ انسان اور جنات اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتے کہ اس کا کوئی شریک ہے پس جب ہم نے قرآن سن لیا تو ہمیں ان کے کہے ہوئے بطلان کا یقین آ گیا۔اور ہم ایمان لے آئے ہیں کہ وہ وحدہ لا شریک له ہے اپنی ذات وصفات میں۔

(۶) وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ (ترجمہ:۔اور یہ کہ کچھ مرد تھے) جاہلیت کے دور میں مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ (ترجمہ:۔انسانوں میں سے پناہ لینے والے) اعوذ و استعاذة ایک ہی ہے۔اسی سے اللہ کا ارشاد ہے فاستعذ بالله من الشيطان الرجيم (النحل ۹۸) . بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (ترجمہ:۔جنوں کے کچھ مردوں کی) حسن، ابن زید وغیرہما کہتے ہیں عرب جب کسی وادی میں اترتے تھے تو یوں کہتے تھے اعوذ بسيّد هذا الوادى من شر سفهاء قومه. پھر صبح تک اسی کی پناہ میں رات بسر کر لیتے تھے۔اور مروی ہے کہ جنات انہیں جواب دیا کرتے تھے۔لا نملک لکم ولا نفسنا من اللهشيئا۔ابو حیان کہتا ہے کہ مقاتل نے کہا ہے سب پہلے پہل جنات کی پناہ مانگنے والے یمن کے لوگ تھے ان کے بعد بنو حنیفہ کے لوگ تھے اس کے بعد عرب میں یہ رواج عام ہو گیا۔ فَزَادُوْهُمْ (ترجمہ:۔تو انہوں نے بڑھا دیا ان کی) یعنی جنات سے پناہ مانگنے والے لوگوں نے رَهَقًا (ترجمہ:۔سرکشی کو) یعنی تکبر اور سرکشی میں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جنات نے پناہ مانگنے والوں کی شرارت وسرکشی کو بڑھا دیا کہ انہوں نے انہیں مختلف امور میں گمراہ کیا یہاں تک کہ وہ اس میں پناہ مانگنے لگے۔واحدی کہتے ہیں کہ رھق کے معنی ہیں کسی چیز کو ڈھانپ لینا اور اسی سے ارشاد ربانی ہے۔ ولا يرهق وجو ههم قتر (یونس ۲۶)۔یعنی ان کے چہروں پر نہیں چھائے گی۔ابن جبیر کہتے ہیں کہ رھقا کے معنی ہیں کفراً۔قتادہ اور ابو عالیہ کہتے ہیں کہ فزادوهم کا مطلب ہے جنات نے انسانوں کے خوف کو بڑھا دیا کہ اپنی لامحدود طاقت ان کے دل میں بٹھا دی اور جب انہوں نے ان کی بے صبری دیکھی تو ان پر غصہ ہوئے اور انہیں حقیر سمجھا اور انہیں دھتکار دیا۔اسی طرح سے انسان جنات کے حسد وعداوت میں بڑھتے چلے گئے کیونکہ وہ انہیں مسخر کرتے تھے اپنے عزائم و اوراد کے ذریعہ اور ان سے خدمت لیتے تھے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ رھق کے معنی ہیں گناہ۔اور اسی سے اعشٰی کا یہ قول ہے۔

لا شئی ینفعنی من دون رویتها لا یشتفی وامق مالم یصب رهقا

(۷) **وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا** (ترجمہ:۔اور یہ کہ انہوں نے گمان کیا) یعنی انسانوں نے **كَمَاظَنَنْتُمْ** (ترجمہ:۔جیسا کہ تم نے گمان کیا) اے جنات کہ یہ آپس کا کلام ہے۔**اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا** (ترجمہ:۔کہ اللہ کسی کو ہرگز نہ اٹھائے گا) جو نبوت و ذمہ داری کا حامل ہو۔کیونکہ کفار مکہ میں سے بعض لوگوں نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ کسی ایک کو بھی مبعوث نہیں کرے گا۔ابراہیم کی طرح۔

(۸) **وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ** (ترجمہ:۔اور یہ کہ ہم نے آسمان کو چھوا) **لمس** کے معنی ہیں چھونا پھر یہ طلب کے لئے استعارتاً استعمال ہونے لگا۔اور مضاف اس میں حذف کر دیا گیا ہے۔یعنی **خبر السماء** یہ اس لئے کہ وہ لطیف ارواح ہیں جو پلک جھپکتے آسمان تک پہونچ جاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ جب ہم آسمانوں تک پہونچے یا قریب ہوئے **فَوَجَدْنٰهَا** (ترجمہ:۔تو ہم نے اسے پایا) یعنی آسمان کو **مُلِئَتْ حَرَسًا** (ترجمہ:۔پہرے دار سے معمور) یہ **وجد** کا مفعول ثانی ہے۔یا **وجدنا** سے حال ہے۔یہ اس وقت ہوگا جب **وجد** بمعنی اصاب ہوگا۔اعرج نے اسے "ملئت" یائے کے ساتھ پڑھا ہے۔اور جمہور نے ھمزہ کے ساتھ **ملئت** پڑھا ہے۔اور حرس' حارس کی جمع ہے۔اور حارس کے معنی ہیں محافظ جیسے خدم' خادم کی جمع ہے۔**وعاس وعس** کی طرح اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ اسم جمع ہے اور اسی وجہ سے اس کی صفت مفرد لائی گئی ہے۔اور وہ ہے لفظ **شدید شَدِيْدًا** (ترجمہ:۔سخت) قوی' مضبوط اور وہ ہیں فرشتے جو انہیں آسمان دنیا پر چڑھنے سے روکتے ہیں **وَّشُهُبًا** (ترجمہ:۔اور انگاروں سے) یہ شہاب کی جمع ہے۔ازہری نے ابن سکیت سے روایت کی ہے کہ شہاب' جلتی ہوئی لکڑی کو کہتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں شعلۂ نار اور شیطان کے پیچھے ٹوٹنے والے ستارے کو بھی شہاب کہا جاتا ہے۔اور اسی سے ہے **فاتبعه شهاب ثاقب** (الصافات ۱۰)

(۹) **وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْلَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا** (ترجمہ:۔اور ہم سننے کے لئے اس کے کچھ ٹھکانوں میں بیٹھ جاتے تھے تو اب جو کوئی کان لگائے تو وہ اپنی گھات میں آگ کا شعلہ تیار پائے گا) فراء کہتا ہے کہ یعنی شعلہ جو اس کے لئے تیار کیا گیا ہے۔تاکہ اس کے ذریعہ اس کا نشانہ باندھا جائے اور **رصداً کارا صداً** پڑھنا بھی جائز ہے۔یعنی اس زمانے سے پہلے آسمان کے بعض ٹھکانوں میں جہاں پر ملائکہ میں سے نگہبانی کرنے والے نہیں ہوتے تھے وہیں بیٹھ جاتے تھے پھر ہم زمین کے اندر ہونے والے بعض حوادث کے متعلق فرشتوں کی باتیں سن لیتے تھے۔اور وہ خبریں ہم کاہنوں اور نجومیوں کو بتلاتے تھے۔جنہوں نے ہمیں اسی کام کے لئے مسخر کر رکھا تھا۔اور یہ ہماری قدیم زمانے سے عادت تھی لیکن اب جو بھی کان لگا کر سنے گا تو وہ آگ کا شعلہ پائے گا۔**رصد** کے معنی ہیں حفاظت کرنے کے لئے تیار۔ابوبکر نے کہا ہے کہ **فلان یر صد فلاناً** کے معنی ہیں فلاں شخص فلاں کے راستے پر بیٹھ گیا۔اسی سے ہے **فاتبعه شهاب ثاقب**۔میں کہتا ہوں کہ یہ سب جنات کے اقوال ہیں۔مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ ابی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے سے لے کر نبی پاک ﷺ کی بعثت تک ستاروں کے ذریعہ کسی کو بھی نشانہ نہیں بنایا گیا۔نبی ﷺ کی بعثت کے بعد ہی ستاروں سے نشانہ بنایا گیا۔تو قریش نے جب اسے دیکھا جو انہوں نے اس سے پہلے

نہیں دیکھا تھا تو وہ گھبرا گئے پھر وہ اپنے جانوروں کے کان چیرنے لگے اور غلاموں کو آزاد کرنے لگے۔ اور یہ بات ان کے بڑوں تک پہونچی تو انہوں نے کہا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو وہ کہنے لگے کہ ستاروں کے ذریعہ نشانہ باندھا گیا ہے جسے ہم نے آسمان سے اترتا دیکھا ہے۔ جس پر بڑوں نے کہا کہ صبر کرو اگر وہ معروف ستارہ ہوگا تو وہ انسانوں کی تباہی کا وقت ہوگا اور اگر کوئی غیر معروف ستارہ ہوگا تو یقیناً کوئی حادثہ رونما ہوگا۔ پھر جب انہوں نے غور وفکر کیا تو وہ غیر معروف ستارے کا ٹوٹنا تھا۔ پھر وہ کہتا ہے کہ نبی ﷺ کے ظہور کے وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ پھر وہ تھوڑا ہی عرصہ ٹھیرے تھے کہ ابوسفیان آیا اور اس نے ان لوگوں کو آکر خبر دی کہ محمد ﷺ ابن عبداللہ کا ظہور ہے۔ اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی مرسل ہے۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ اہل نجوم نے بھی اسی طرح اپنے احکام کی کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ ستارہ کا ٹوٹنا منظم حادثے کے ظہور کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور یہ اہل عرب کے معتقدات میں سے تھا۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے اسے اپنے اشعار میں بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس پر حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے ستارے کو ٹوٹتا دیکھا تو پوچھا کہ تم لوگ جاہلیت کے دور میں ایسے موقع پر کیا کہا کرتے تھے؟ تو انہوں نے کہا ہم کسی عظیم شخصیت کی موت یا عظیم بچہ کی ولادت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے پہلے ستاروں کا ٹوٹنا تھا اور ستاروں کے ٹوٹنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ کواکب کے ٹکڑے ہوتے ہیں اس کے اطراف سے ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہیں۔ جیسا کہ شیخ نے الشفاء میں بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے بیان کیا ہے کہ غزنین کے امیر مسعود کے عہد میں ایک شہاب ثاقب ٹوٹا جسے لوگوں نے بعض جنگلات اور میدانوں میں دیکھا اور پھر انہوں نے اسے غزنین کے امیر کے پاس بھیجدیا۔ اس نے لوہاروں کو حکم دیا کہ اسے گلائیں لیکن وہ گلا نہیں حالانکہ انہوں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن وہ اسی کو گلانے اور گھلانے سے عاجز آ گئے۔ پھر امیر نے حکم دیا کہ اس سے تلواریں بنائیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شہاب اجسام کثیف ہیں جو فلک قمر کے نیچے ہوتے ہیں۔ اور کثیف ہونے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ پھر وہ قوی حرکت کے ذریعہ ہلتے جلتے ہیں کیونکہ اس کی کثافت اسے زمین کی طرف کھینچتی ہے۔ پس وہ محض اس حرارت سے مشتعل نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ جب وہ کسی ایسی چیز سے ٹکرا جائے جس میں شعلے کی استعداد ہو یا سخت گرم، قوی اور لطیف ہوا اسے مل جائے مثلاً آکسیجن وغیرہ۔ پھر جب اس سے اجزائے کبریتیہ ٹکراتے ہیں یا اس طرح کی گرم ہوا سے ٹکراتا ہے تو وہ شعلہ بن جاتا ہے۔ پھر جب اس مقام سے عبور کر جاتا ہے تو اس کا شعلہ باقی نہیں رہتا۔ اور وہ کسی سفید چیز کی طرح نظر آتا ہے۔ حتی کہ اس کی آگ بجھ جاتی ہے پھر وہ نظر بھی نہیں آتا۔ علماء ہیئت نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ پس اس بیان کے مطابق اس کے ٹوٹنے کا سبب یہی ہوتا ہے کہ اس میں کثافت پائی جاتی ہے جو طبعاً پستی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اور اہل حق کا کہنا ہے کہ وہ جنات کو نشانہ بنانے کے لئے ٹوٹتا ہے تاکہ وہ آسمان کی خبریں سن نہ سکیں جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ستارہ کسی کی موت یا حیات سے نہیں ٹوٹتا بلکہ اللہ جب کوئی معاملہ آسمانوں میں طئے فرماتا ہے تو زمین کے حاملین تسبیح پڑھتے ہیں۔ پھر آسمانوں والے تسبیح پڑھتے ہیں یہاں تک کہ دنیاوی آسمان تک وہ تسبیح پہونچتی ہے۔ اور آسمان والے حاملین عرش سے پوچھتے ہیں کہ رب نے کیا ارشاد فرمایا پھر وہ انہیں اس کی خبر

دیتے ہیں۔اوراسی طرح وہ خبر ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پہونچتی رہتی ہے یہاں تک آسمان دنیا تک منتہی ہوتی اور جنات اپنے اپنے ٹھکانوں میں بیٹھ جاتے تھے اور وہاں سے خبریں چراتے تھے۔اور پھر انکا نشانہ باندھا جاتا تھا۔جو کوئی خبر بھی وہ لاتے تھے تو وہ حق ہوتی لیکن وہ اس میں اپنی طرف سے اضافہ بھی کر دیتے تھے اور دیگر اکثر مرفوع احادیث میں اس حدیث کے معنی مروی ہوئے ہیں اور اس کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے۔جیسا کہ اللہ فرماتا ہے۔فاتبعه شهاب ثاقب۔پس اس بیان کے مطابق ستارے کا ٹوٹنا جنات اور شیاطین کے نشانہ باندھنے کا موجب ہوتا ہے تاکہ وہ آسمان کی خبریں چرا نہ سکیں۔صاحب کشاف کا بھی اسی طرف میلان ہے اور اس نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضور کی بعثت سے قبل تھا اور پھر رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا تو رجم بڑھ گیا۔اور ظاہری طور پر بڑھ گیا۔یہاں تک جنات اور انسان بھی اس سے آگاہ ہوگئے۔اور خبروں کا چرانا منع کر دیا گیا ہے۔اکثر مفسرین کا یہی نظریہ ہے

(۱۰) **وَاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ** (ترجمہ:۔اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں سے کوئی برائی کا ارادہ کیا گیا) شر یعنی برائی سے مراد عذاب ہے۔ **اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا** (ترجمہ:۔یا ان کے رب نے ان کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے) یعنی خیر کا۔

(۱۱) **وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ** (ترجمہ:۔یہ کہ ہم میں سے کچھ نیک ہیں) یعنی صلاح سے موصوف ہیں۔کہا گیا ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید کا سننا ہے۔یعنی ان کے نفوس خیر اور صلاح کو قبول کرنے والے ہیں۔ **وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ** (ترجمہ:۔اور ہم میں سے کچھ اس کے سوا بھی ہیں) یعنی خیر اور صلاح کو قبول نہیں کرتے اور وہ ان میں سے کفار لوگ ہیں۔ **كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا** (ترجمہ:۔ہم کئی راہوں میں متفرق ہیں) ابن عباسؓ فرماتے ہیں یعنی مختلف خواہشات اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں پوشیدہ راز۔جیسا کہ ایک شاعر نے کہا۔

القابض الباسط الهادی بطاعته فی قینة الناس اذ اهوا وهم قدد

زجاج نے کہا ہم متفرق جماعتوں میں منقسم تھے اور اس کے قریب کے معنی فراء نے بھی ذکر کئے ہیں۔یعنی گروہ جن کی خواہشات مختلف ہوں۔حسنؒ کہتے ہیں جنات بھی تمہاری طرح قدریہ، مرجیہ، خارجی اور رافضی اور شیعہ وغیرہ ہوتے ہیں۔اور سدّی کا بھی یہی کہنا ہے۔میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے اس پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ جنات نے یہ بات مسلمان ہونے سے پہلے کہی تھی یعنی یہ کہ ہم اسلام لانے سے پہلے کئی راہوں میں متفرق تھے یعنی وہ مشرک، مجوسی، یہودی اور نصاریٰ تھے لیکن مسلمان ہونے کے بعد ان کا مختلف گروہوں میں بٹنا ممکن ہے اور اس پر نبی ﷺ کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے۔عنقریب میری امت (۷۳) فرقوں میں منقسم ہو جائے گی اور جب جنات آپ کی امت میں داخل ہیں تو انسانوں کے فرقوں کی طرح ان کا بھی فرقوں میں تقسیم ہونا ممکن ہے۔

(۱۲) **وَّاَنَّا ظَنَنَّآ** (ترجمہ:۔اور ہم نے یقین کر لیا ہے) یعنی جان لیا ہے **اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ** (ترجمہ:۔کہ ہم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے) رہتے ہوئے **فِی الْاَرْضِ** (ترجمہ:۔زمین میں) جہاں کہیں بھی ہوں کناروں پر یا وسط میں کیونکہ مخلوق کی شان عجز

واحتیاج ہے پس ہم اللہ کو کیسے عاجز کر سکتے ہیں۔حالانکہ وہ ہمارا خالق ہے اور ہر شئے پر قادر ہے۔**وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا**(ترجمہ:۔اور نہ اسے عاجز کر سکتے ہیں بھاگ کر) یعنی زمین سے آسمانوں کی طرف بھاگ کر۔کیونکہ ہر مکان اس کی ملک اور اسی کی سلطنت ہے پس اگر اس نے ہمارے ساتھ ذلت وافتقار وہلاکت وتباہی کا ارادہ فرمالیا تو ہمارے لئے ممکن نہ ہوگا کہ ہم بھاگ کر اسے عاجز کر سکیں۔

(۱۳) **وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى**(ترجمہ:۔اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت سنی) اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ وہ پورے کا پورا ہدایت ہے **اٰمَنَّا بِهٖ**(ترجمہ:۔اس پر ایمان لے آئے) بغیر پس وپیش اور بغیر کسی سوچ بچار۔ **فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ** (ترجمہ:۔تو جو اپنے رب پر ایمان لے آئے) اس کے رسول پر اور اس چیز پر جو شرائع واحکام میں سے اس پر نازل کی گئی ہے۔**فَلَا يَخَافُ بَخْسًا**(ترجمہ:۔تو وہ نہیں ڈرے گا کسی سے) اعمش نے اسے **فلا یخف** پڑھا ہے۔اور جمہور نے **بخسا** ''خ'' پر سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔اور ابن وثاب نے ''خ'' پر زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔اور **بخس** کے معنی ہیں نقص **وَّلَا رَهَقًا**(ترجمہ:۔اور نہ کسی زیادتی کا) اور وہ ظلم ہے۔ازہری کہتا ہے کہ اس آیت میں لفظ **رھق** ' **ارھاق** سے اسم ہے۔اور وہ کہتے ہیں کسی شخص پر ایسا بوجھ ڈالنے کو جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں ذلت۔اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں نیکیوں میں کمی اور گناہوں میں اضافہ۔صاحب کشاف کہتے ہیں کہ **جزاء بخس ولا رھق**(کمی اور بیشی کی جزاء)

(۱۴) **وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ**(ترجمہ:۔اور یہ کہ ہم میں سے کچھ مسلمان ہیں) یعنی اطاعت گذار مومن ہیں۔**وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ**(ترجمہ:۔اور ہم میں سے کچھ ظالم ہیں) طریق حق سے ہٹنے والے اور وہ طریق حق ایمان ہے۔کہا جاتا ہے **قسط** ' **یقسط** 'قسوطا ۔یعنی جار' **یجور** 'جوراً۔**قسوط** کے معنی ہیں ''جور'' اور حق سے ہٹ جانا۔فراء کہتا ہے کہ اس سے مراد ظالم کافر ہیں اور حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے۔ **امرت بقتال الناکثین والقاسطین والمارقین**(مجھے عہد شکن' ظالم اور نکل جانے والوں سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔) **ناکثون** اہل جمل تھے کیونکہ انہوں نے اپنی بیعتوں کو توڑ دیا تھا اور **قاسطون** اہل صفین تھے کیونکہ فیصلے کے بارے میں جور کا ارتکاب کیا اور حضرت علیؓ سے بغاوت کی **مارقون** سے مراد خوارج ہیں کیونکہ وہ دین سے یوں نکل گئے جیسے تیر اپنے نشانوں سے نکل جاتا ہے۔ **مقسطون**. عدل پرور مسلمان ہیں اللہ نے فرمایا۔**ان اللہ یحب المقسطین**۔(المائدۃ ۴۲) ''اقساط'' کے معنی ہیں تقسیم اور فیصلے میں عدل کرنا۔ **فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا**(ترجمہ:۔تو جنہوں نے فرمانبرداری کی تو انہوں نے بھلائی کا راستہ تلاش کر لیا) یعنی راہِ حق کا مقصد کیا۔اور کسی بھی شئے میں **تحری** کے معنی ہیں اجتہاد۔فراء کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کو قبول کیا۔

(۱۵) **وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا**(ترجمہ:۔اور جہاں تک ظالموں کا تعلق ہے وہ ہو گئے) اللہ کے علم میں **لِجَهَنَّمَ حَطَبًا**(ترجمہ:۔جہنم کا ایندھن) آگ کا ایندھن

(۱۶) **وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا**(ترجمہ:۔اور اگر وہ قائم رہتے) اَن ثقیلہ سے خفیفہ ہے اور تقدیر کلام ہے۔'انہ' کیونکہ یہ ضمیر

شان میں عمل کرتی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ شان یہ ہے کہ اگر جن وانس قائم رہتے۔ **عَلَى الطَّرِيقَةِ** (ترجمہ:۔سیدھے راستے پر) **لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا** (ترجمہ:۔ہم انہیں کثیر پانی سے ضرور سیراب کرتے) غدق کے معنی ہیں ماء کثیرا اور اس پر دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے ولو ان اهل القرى امنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء ۔(الاعراف ۹۶) ثعلب کہتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ راہِ کفر پر قائم رہتے تو ان پر ہم دھوکے کا دروازہ کھول دیتے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ لجعلنا لمن يكفر برحمن لبيو تهم سقفامن فضة۔(الزخرف ۳۳) لیث کا قول ہے کہ یعنی ہم ان پر معیشت کے دروازے کھول دیتے۔ اور یہ اس لئے کہ وافر پانی معیشت کے اضافہ کا سبب ہوتا ہے پس سبب کو ذکر کر کے مسبب مراد لیا گیا ہے۔ اور فراء کہتا ہے اگر وہ کفر پر قائم رہتے تو ہم ان کے مال میں ضرور اضافہ کر دیتے۔ پہلے قول کی طرف ابن عباسؓ ' مجاہد' قتادہ اور ابن جبیر کا بھی میلان ہے۔ کیونکہ وہ استقاموا میں پوشیدہ ضمیر کو "من اسلم" کی طرف لوٹاتے ہیں۔ جبکہ دوسرے قول کی طرف ربیع بن انس' ضحاک' زید بن اسلم اور ابو مجلز کا میلان ہے۔

(۱۷) **لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ** (ترجمہ:۔تا کہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں) یعنی امتحان لیا جائے کہ وہ کس طرح اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ کفرانِ نعمت کی وجہ سے ہم انہیں عذاب دیں۔ **وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ** (ترجمہ:۔اور جو اپنے رب کی یاد سے منہ موڑے) یعنی اس کی عبادت سے **يَسْلُكْهُ** (ترجمہ:۔ اس کو چلائے گا) یعنی داخل کرے گا **عَذَابًا صَعَدًا** (ترجمہ:۔سخت عذاب میں) صعود کے معنی ہیں مشقة اور اس سے ارشاد ربانی ہے سارهقة صعوداً (المدثر ۱۷) یعنی عذاب کی مشقت۔ کہا جاتا ہے کہ آلمته صعود ذات صعداء يشتد صعودها على الراقي (میں نے اسے مشقت والی چڑھائی پر چڑھا کر ایذاء پہونچائی کہ چڑھنے والے اس کی چڑھائی شدید ہوتی ہے) معنی یہ ہوں گے کہ سخت عذاب یعنی مشقت اور مشکل چڑھائی والا۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ صعداً دوزخ میں ایک پہاڑ کا نام ہے جو چکنا پتھر ہے۔ کافر کو اس پر چڑھنے کا مکلّف بنایا جائے گا۔ پھر اس کے آگے طوق لٹکائے جائیں گے اور پشت سے ہتھوڑے برسائے جائیں گے یہاں تک کہ چالیس برس میں اس کی چوٹی پر پہونچے گا۔ جہاں سے اسے نیچے گرا دیا جائے گا اور پھر دوبارہ چڑھنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور یہ اس کے ساتھ مستقل ہوتا رہے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی طرف اللہ نے اشارہ فرمایا یعنی سارهقه صعودا۔

(۱۸) **وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا** (ترجمہ:۔اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کی ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو) جیسے مشرک عبادت کرتے ہیں تقدیر عبارت یوں ہے کہ قل اوحى الى ان المساجدلله۔ خلیل کہتے ہیں کہ مساجد اللہ ہی کی ہیں لہذا اس کے ساتھ کسی معبود اور بت وغیرہ کی عبادت مت کرو۔ لفظ مساجد یا تو مسجد کی جمع ("ج" پر زبر کے ساتھ) ہے اس صورت میں اس سے مراد سجود ہوں گے پھر معنی ہوں کہ تمام سجود اللہ کے لئے ہیں۔ اور پس غیر اللہ کے جائز نہیں کیونکہ لله میں لام اختصاص کا ہے۔ اور اس مفہوم کے اعتبار سے فرشتوں کا سجدہ آدمؑ کے لئے نہیں تھا بلکہ اللہ کے لئے تھا وہ اس معنوں میں کہ انہوں

ے اللہ کے امر کے تحت سجدہ کیا تھا پس وہ اللہ کے امر کے اطاعت گزار بنے آدمؑ کی جہت کی طرف سجدہ کرتے ہوئے یا لفظ مساجد' مسجد (ج کے زیر کے ساتھ) کی جمع ہے۔ پھر اس سے مراد وہ جگہ ہوگی جو اللہ کی عبات کے لئے بنائی گئی ہے پھر اس میں یہود و نصاری کے عبادت گاہ خانے بھی شامل ہیں کیونکہ ان کے بنانے والوں نے انہیں اللہ ہی کی عبادت کے لئے بنایا ہے۔ اور صحیح یہی ہے کہ مسجد سے مراد سجدہ کی جگہ ہے اسی طرح حسن سے مروی ہے کہ بعض کے قول سے مروی ہے کہ یہ آیت اس وقت سے متعلق ہے جب قریش کا کعبہ پر غلبہ تھا تو رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ تمام جگہیں اللہ ہی کے لئے ہیں آپ جہاں بھی ہوں اس کی عبادت کریں یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔ تمام انسانوں کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا غنائم آپ کے لئے حلال کی گئیں اور زمین آپ کے لئے پاک کردی گئی اور اسی وجہ سے ہی زمین کے ذریعہ تیمّم کرنے اور زمین کو مسجد بنانے کا حکم دیا گیا اور آپ کو جوامع الکلم عطا فرمائے گئے۔ اور رعب کے ذریعہ آپ کی مدد کی گئی۔ اور زمین کے خزانوں کی چابیاں عطا کی گئیں اور آپ کے ذریعہ نبوت کو ختم کردیا گیا۔ مسجد کی اللہ کی طرف نسبت اس کے شرف و تکریم کے طور پر ہے۔ اور یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد زید' مسجد عمرو سے حقیقی مراد نہیں ہوتی بلکہ مجازاً ہے کیونکہ حقیقی طور پر مسجد کی اضافت اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں ہوتی۔

(۱۹) **وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُاللّٰهِ** (ترجمہ:۔ اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا) اللہ کے بندے نبی ﷺ ہیں اور یہاں عبداللہ فرمایا ہے کہ نبی اللہ نہیں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ عبداللہ نبی ﷺ کا سب سے زیادہ پسندیدہ نام تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ نے عبد کی اضافت جب اپنی ذات کی تو ثابت ہوا کہ یہ اللہ کا بندہ ہے۔ اس سے فائدہ حاصل ہوا کہ آپ حقیقی موحد تھے کیونکہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ نے وضاحت فرمائی کہ اس کے اور مخلوق کے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ اس معنی میں کوئی ایسی شئے نہیں ہے جس پر یہ اطلاق کیا جائے کہ وہ تو خالق ہے نہ مخلوق۔ عابد ہے نہ معبود بلکہ فی الواقع یہ دو چیزیں ایک خالق ہے معبود ہے اور دوسری مخلوق عابد ہے۔ پس جب افضل مخلوق اور اکمل عابد رسول اللہ ﷺ ہیں تو اللہ نے لفظ عبداللہ سے آپ ﷺ کی ذات کا ارادہ فرمایا ہے۔ چوتھی وجہ ہے کہ صاحبان کشف و یقین کے نزدیک عبداللہ سے مراد وہ ذات ہے جو اللہ کے صفات و کمالات کا جامع ہو۔ پس ہر اسم کے ملکات اور کمالات اس کی ذات میں موجود ہوں پس آپ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی اولوالعزم اور مرسل ایسا نہیں ہے جس میں یہ قدسی صفات جمع ہوں اس لئے آپ ﷺ پر عبداللہ کا اطلاق فرمایا گیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ قول کلام جن سے مراد ہے۔ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ ورنہ قرآن پاک کا نظم اس سے خلل پذیر ہوتا ہے **يَدْعُوْهُ** (ترجمہ:۔ اس عبادت کرنے) یعنی اللہ کی عبادت کرنے کے لئے۔ **كَادُوْا** (ترجمہ:۔ قریب تھا کہ وہ) یعنی جن وانس **يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ** (ترجمہ:۔ ہوتے اس پر) یعنی نبی ﷺ پر۔ **لِبَدًا** (ترجمہ:۔ ٹھٹ کے ٹھٹ) یعنی حسد و عداوت اور کفر و ضلالت کی فراوانی اور زیادتی کی وجہ سے اوپر تلے' ایک دوسرے پر گرتے پڑتے لپکتے ہوئے۔ لبدا 'لبدۃ کی جمع ہے۔ اور اس کے معنی ہیں بعض چیز کا بعض پر چمٹ جانا۔ ایک چیز کا دوسری پر تہہ بہ تہہ ہونا۔ زجاج کہتا ہے کہ اس کے معنی ہیں ایک کا دوسرے پر چڑھ جانا۔ اور جمہور نے

لبد کو ''ل'' کی زیر کے ساتھ لبداً پڑھا ہے۔ جبکہ مجاہدؒ ابن عامر اور ابن محیصن نے اس کے برخلاف ''ل'' کے پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن محیصن سے ''ل'' کے پیش اور ''با'' کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ حسن اور ابن زید فرماتے ہیں کہ جب نبی ﷺ دعوت کے لئے کھڑے ہوئے تو جن وانس اس بات پر متفق ہوگئے کہ اس دعوتِ تبلیغ کو ناکام کردیں لیکن اللہ نے اسے ٹھکرادیا۔ اس نے اپنے بندہ کی نصرت فرمائی اور اپنے نور کو پورا فرمایا۔ ازہری کہتا ہے کہ اس کے معنی ہیں نبیؐ نے بطن نخلہ میں جب صبح کی نماز پڑھی تو جنات قرآن سن کر جمع ہوگئے اور بڑے متعجب ہوئے قریب تھا کہ وہ آپ ﷺ پر اژدھام کی صورت میں گر پڑتے اور ان کا یہ اژدھام فرط حیرت سے تھا۔ اللہ کے نور کو بجھانے کے لئے نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ آپ ﷺ پر ایمان نہ لاتے۔

(۲۰) **قُلْ** (ترجمہ:۔ آپ فرمائیں) اے اللہ کے رسول انہیں جواب دیتے ہوئے **اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ** (ترجمہ:۔ میں اپنے رب کی عبات کرتا ہوں) یعنی میں اس اکیلے کی عبادت کرتا ہوں۔ **وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ** (ترجمہ:۔ اور اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا) عبادت میں۔ **اَحَدًا** (ترجمہ:۔ کسی کو بھی) اس کی مخلوق میں سے۔

(۲۱) **قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا** (ترجمہ:۔ فرمایئے بے شک میں تمہارے لئے کسی نقصان کا مالک نہیں اور نہ) یعنی میں ازخود اس بات پر قادر نہیں کہ تم سے نقصان کو دفع کرسکوں اور نہ اس پر کہ تمہاری طرف لے کر آسکوں۔ **وَّلَا رَشَدًا** (ترجمہ:۔ بھلائی کو) یعنی خیر کو۔ بعض کا کہنا ہے کہ ضر سے مراد کفر اور رشد سے مراد ہدایت ہے۔

(۲۲) **قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ** (ترجمہ:۔ آپ ان سے کہدیں مجھے نہیں بچا سکتا) میری مدافعت نہیں کرسکتا **مِنَ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔ اللہ سے) یعنی اللہ کے عذاب اور اس کی ناراضگی سے۔ **اَحَدٌ** (ترجمہ:۔ کوئی بھی) لوگوں میں سے۔ **وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ** (ترجمہ:۔ اور نہ میں اس کے سوا کسی کو پاؤں گا) یعنی اللہ کے سوا کیونکہ وہ اپنی ذات و وجود اور ضروریات میں میری طرح محتاج نہیں ہے۔ **مُلْتَحَدًا** (ترجمہ:۔ پناہ) فراء نے کہا یعنی جائے پناہ اور تہہ خانہ جس میں پناہ لی جائے۔ اور مبرد نے کہا ملتحداً منعرجا کی طرح ہے اور لغت میں اس کے معنی مٹی میں لت پت ہونا اور ملتحدا زمین میں داخل ہونے کی جگہ ہے۔ اور یہ بھی قول ہے کہ ملتحدا کے معنی چلنے پھرنے کی جگہ اور الی بلاغا من اللہ کی استثناء میں اختلاف ہے۔

(۲۳) **اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔ مگر (سوائے) اللہ کی طرف سے پہونچانا) حسن کہتے ہیں کہ یہ استثناء منقطع ہے تو اس کے معنی ہیں کوئی بھی پناہ نہیں دیگا لیکن اگر میں نے پہونچادیا جو میری طرف وحی کیا گیا ہے تو مجھ پر رحم کرے گا اور پناہ دے گا اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ مستثنیٰ متصل ہے یعنی سوائے اس کے کہ میں پہونچاؤں اور اطاعت کروں اس میں جس کا اس نے مجھے حکم دیا تو وہ مجھے پناہ دے گا۔ عبداللہ رازی کہتے ہیں کہ مستثناء منقطع ہے کیونکہ من دونہ ملتحدا کہا گیا ہے اور اللہ کی طرف سے پہونچانا۔ من دونہ ملتحدا کے قول کے تحت داخل نہیں ہے۔ کیونکہ پہونچانا اللہ کی طرف سے ہے دون اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ یہی فراء کا قول ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ یہ بدل ہونے کی وجہ سے منسوب (ملتحدا) ہے یعنی لن اجد من دونہ ملتحدا لا ان ابلغ ماوحی الی من

الله ۔ابوحیان کہتے ہیں کہ یہ بھی قول ہے کہ ''الا'' بمعنی ان و لا کے ہے اور ان شرطیہ ہے۔تقدیر کلام یہ ہوگی ان لم ابلغ بلاغاً من الله لن یجیرنی من الله احد۔اور فعل کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

فطلّقها ظست لها بكفء والا يَعُلُ مفرقک الحسام

میرے نزدیک زیادہ مناسب فراء کی رائے ہے واللہ اعلم ۔ **وَرِسٰلٰتِهٖ** (ترجمہ:۔اور اس کے پیغاموں کو پہونچانا) بلاغا پر عطف ہے۔اور اس سے مراد قرآن کی سورتیں ہیں **وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ** (ترجمہ:۔اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے) یعنی ان پر ایمان نہ لائے **فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ** (ترجمہ:۔تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے) ان کو زیر کے ساتھ پڑھا گیا' مستانفہ جملہ ہونے کی وجہ سے اور اس کو بالفتح بھی پڑھا گیا کہ وہ من یعص الله ورسوله کی جزاء ہے۔ **خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا** (ترجمہ:۔جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) یعنی جہنم میں کیونکہ عصیان سے مراد کفر ہی ہے دوسری مراد نہیں ہے۔پس عاصی کافر ہے اور کافر کے مخلد فی النار ہونے میں کوئی شک نہیں۔

(۲۴) **حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ** (ترجمہ:۔ یہاں تک کہ وہ اس چیز کو دیکھ لیں گے جن کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے) اس بارے میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ مایوعدون سے مراد یوم بدر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یوم القیامت ہے۔معنی یہ ہیں کہ جب وہ دیکھ لیں گے۔جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے یا تو وہ عذاب ہے یا قیامت کا دن ہے۔ **فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا** (ترجمہ:۔تو اب وہ جان لیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور گنتی میں کم) یعنی نہیں دیکھیں گے مدد کرنے والوں اور شفاعت کرنے والوں کو

(۲۵) **قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ** (ترجمہ:۔فرمادیجئے میں نہیں جانتا) ان ادری کے معنی ہیں لاادری **اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا** (ترجمہ:۔کیا قریب ہے وہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے یا مقرر فرمادی ہے اس کے لئے میرے رب نے کوئی طویل مدت) یعنی غائت معینۃ۔یعنی یہ ہیں کہ قیامت کا وقوع امر قطعی ہے البتہ اس کے وقوع کا وقت نامعلوم ہے۔

(۲۶۔۲۷) **عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ** (ترجمہ:۔ غیب جاننے والا تو اپنے غیب پر کسی کو اطلاع نہیں دیتا مگر جنہیں پسند فرمالیا رسولوں میں سے) جمہور نے یظھر کو اظھر کے باب سے اور حسن نے ظھور کے باب سے پڑھا ہے۔اور عالم الغیب کو مدح ہونے کی وجہ سے نصب کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔اور سدی کہتے ہیں کہ عالم الغیب فعل ماضی ہے۔اور جمہور نے عالم الغیب کو اسم فاعل کے وزن پر میم کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔آیت کا ظاہری مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی ایک کو بھی اپنے غیب پر اطلاع کامل عطاء نہیں فرماتا مگر رسول کو جسے اس نے منتخب فرمالیا ہو۔پس اس کے علاوہ کسی اور کو مطلع نہیں کرتا۔غیب کی مراد میں اختلاف ہے۔کیا غیب' غائب ہونے والی کل شی یا اس کے

بعض کو کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد کل غیب ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ غیوب میں سے کسی ایک کے لئے کچھ بھی ظاہر نہیں کرتا۔ یہ اس لئے کہ الغیب پر داخل ''ال'' ستغراق پر دلالت کرتا ہے۔ یہ شوکانی کا اور اس کے متبعین کا نظریہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد بعض غیوب ہیں۔ یہ وہی ہے جسے سورۃ لقمٰن میں ذکر کیا ہے۔ کہ **ان الله عنده علم الساعة وينزل الغيث ويعلم ما فى الارحام وما تدرى نفس ماذا تكسب غدا وما تدرى نفس بايّ ارض تموت ان الله عليم خبير۔** (القمان ۳۴) پس یہی وہ غیوب ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا مگر وہ جنہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اس کا علم اسے عطاء فرمایا ہو تو وہ شخص اللہ کی وحی اور الہام کے ذریعہ اسے جانتا ہے۔ البتہ ان غیوب کے علاوہ دیگر غیوب اس قسم کی غیوب میں سے نہیں ہیں پس ان کا علم کشف وشہود کے ذریعہ ممکن ہے۔ پس عالم الغیب کے ارشاد میں ''غیب'' بہ ایں تقدیر ہے کہ وہ عام ہو پس وہ عام ہے کہ اس میں سے بعض کو خاص کر دیا گیا۔ امام رازی کا قول ہے میرے نزدیک اس آیت میں اس قسم کے اقوال پر کوئی دلالت موجود نہیں ہے۔ اور اس پر دلالت کرنے والا ہے۔ علی غیبه کا ارشاد گرامی۔ اس میں صیغہ عموم نہیں ہے پس اس کی مقتدا پر عمل کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیوب میں سے کسی بھی غیب پر مخلوق کو مطلع نہیں فرماتا۔ پس اسے ہم وقوع قیامت پر محمول کر سکتے ہیں۔ پس آیت سے مراد یہ ہوگی کہ اللہ اس غیب کو کسی ایک کے لئے بھی ظاہر نہیں فرمائے گا۔ پس آیت میں کوئی دلالت باقی نہیں رہے گی کہ وہ غیوب میں سے کسی کو بھی کچھ بھی عطاء نہیں فرمائے گا۔ اور اس تاویل کی تاکید اس آیت کے بعد والا ارشاد گرامی **ان ادرى اقريب ما توعدون ام نجعل له ربى امدا** سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی میں وقوع قیامت کا وقت نہیں جانتا پھر فرمایا کہ **عالم الغيب ولا يظهر على غيبه احداً** یعنی قیامت کے وقوع کا وقت ایسا غیب ہے جسے اللہ کسی ایک پر بھی ظاہر نہیں فرمائے گا۔ یہی ابوحیان اندلسی کا قول ہے اور اس نے بھی وہی کچھ ذکر کیا ہے جو امام رازی اس کی تفسیر میں لائے ہیں۔ لیکن ابوحیان نے اس کا نام نہیں لیا۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ غیب کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم حقیقی غیب۔ یہ وہ قسم ہے جسے اللہ کسی بھی فرد مخلوق پر ظاہر نہیں فرماتا۔ خواہ وہ ملائکہ ہوں یا جن ہوں یا انسان ہوں۔ نبی ہو یا ولی ہو سوائے اس کے جس کو وہ اپنے رسولوں میں سے پسند فرمالے۔ پس اسے اللہ تعالیٰ اس کا الہام فرماتا ہے۔ پھر اس کا وہ ایک حصہ جانتا ہے۔ اور یہ تقدیر کے پوشیدہ رکھنے کی طرح ہے اور اسی قبیل سے ہے **علم الساعة** (قیامت کا علم) اسی لئے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب جبرئیل نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ قیامت کب آئے گی تو آپ نے فرمایا **ما المسئول عنه اعلم من السائل** ۔ لیکن یہ بھی جائز ہے کہ قیامت کے قیام کے نزدیکی کے وقت اس کا علم ظاہر فرمادے جیسے کہ اس حقیقت کا اس ارشاد ربانی میں اشارہ فرمایا گیا ہے '' **ويوم تشقق السماء بالغمام ونزل الملائكة تنزيلا** '' (الفرقان ۲۵) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت فرشتے قیامت کے قیام کو جان لیں گے۔ اسی طرح سے ہے تقدیر کا پوشیدہ رکھنا۔ پس اللہ کسی ایک فرشتے کو آگاہ کر دیتا ہے لیکن اجراء کا وقت اسے نہیں بتاتا۔ اور اسے کوئی بھی نبی وحی کے علاوہ نہیں جان سکتا۔ اسی وجہ سے نبی پاک ﷺ اس بات پر بے چین

تھے کہ آپ کے کنبے کے تمام لوگ آپ پر ایمان لے آئیں اور آپ ان کے رشد و ہدایت کے سلسلے میں بہت کوشاں رہتے تھے۔ یہاں تک اللہ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی۔ "انک لا تھدی من احببت" (القصص ۵۶) بلکہ آپ تو تمام انسانوں کے ایمان لانے پر حریص تھے یہاں تک اللہ فرمایا ولو شاء اللہ لا من من فی الارض کلھم جمیعا (یونس ۹۹) اور یہ آیت دلیل ہے کہ آپ ﷺ تبلیغ کے وقت نہیں جانتے تھے کہ یہ ایمان لائے گا اور وہ ایمان نہیں لائے گا پس تقدیر کے راز کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ شیخ اکبر فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول عزیرؑ تقدیر کے بارے میں بہت زیادہ سوال کرتے تھے یہاں تک اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اے عزیرؑ اگر تو نے تقدیر کے بارے میں سوال کیا تو تیرا نام دیوان نبوت سے مٹادوں گا۔ اور اللہ نے اس سوال کی وجہ سے یہ فرمایا اور اس پر غصہ فرمایا کیونکہ جس پر تقدیر کے راز منکشف کردئے جائیں تو اشیاء کے حقائق کے علم میں بطریق احاطہ تقدیر کے ساتھ مشارک ہوجائے گا۔ حق کا بندہ سے امتیاز نہیں ہوسکے گا۔ شیخ اکبر فتوحات میں فرماتے ہیں کہ اگر علم تقدیر بطریق احاطہ تمام وجوہات کے اعتبار سے اسی طرح معلوم ہوجائے جس طرح اسے اللہ جانتا ہے تو حق کا علم بندہ کے علم سے اس چیز کے ذریعہ متمیز نہیں ہوسکے گا۔ پس جو کچھ بھی اس سے معلوم ہوا اسمیں یہ برابری لازم نہیں آئے گی کیونکہ بندہ اپنے معلوم کے اعتبار سے مطلقاً تعلق علم کی کیفیت سے جاہل ہے۔ اس لئے کسی بھی معلوم کے علم میں حق کے ساتھ اشتراک کا وقوع صحیح نہیں ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اگر تقدیر کا علم ہوتا اس کے احکامات کا بھی علم ہوتا۔ اور اگر اس کے احکامات کا علم ہوتا تو یقیناً بندہ ہر شئے کے علم میں مستقل ہوتا اور کسی بھی چیز کی طرف حق کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور اس کا عدم احتیاج علی الاطلاق ہوتا۔ پس جب تقدیر کا علم یہاں تک پہونچانے کا ہوا تو اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے دور فرمادیا۔ پس تمہارے لئے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ محقق علماء کا میلان ہے کہ تقدیر کا علم اپنے بندوں سے سلب فرمادیا ہے۔ دوسری قسم ہے غیب اضافی۔ اور اس سے مراد ایسا علم ہوتا ہے جو بعض پر مخفی ہوتا ہے اور بعض پر نہیں۔ مثلاً نظریات وغیرہ۔ پس قوتِ قدسیہ والے افراد ان نظریات کو ویسے ہی پہچانتے ہیں جیسے کہ وہ نفس الامر میں ہوتے ہیں۔ اور جن سے یہ قوت مفقود ہوتی ہے تو وہ اسے نہیں جان سکتا۔ اور مثلاً اوراد اور تعویز کرنے والے لوگ جنات کو مسخر کرتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہیں بات کرتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں دیکھتا یا مثلاً فرشتوں کی حقیقت کو انبیاء جانتے ہیں۔ غیر نبی انہیں نہیں جانتا اور مثلاً جنت و دوزخ عرش اور ان کے علاوہ دیگر غائب اشیاء کی طرح کہ نبی ﷺ انہیں جانتے تھے اور سامنے دیکھتے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ بعض افراد پر غائب رہنے والی چیز دوسرے بعض افراد کے سامنے موجود و حاضر رہنا ممکن ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ حساب، جبر، مقابلہ اور مثلثات وغیرہ کا عالم شخص ان فنون میں مذکورہ اعمال کے ذریعہ بہت ساری محسوسات کو جانتا ہے جیسا کہ وہ عالم واقع میں ہیں۔ لیکن وہ نہ جاننے والوں کے نزدیک مجہول ہی ہوتی ہیں۔ اس طرح علم نجوم اور علم ھیئت جاننے والا بھی ایک برج سے دوسرے برج کی طرف منتقل کواکب کے تحویلات کو جانتا ہے اور آثار کو بھی جانتا ہے مثلاً موسموں کی تبدیلی کو ان کے خواص کسوف و خسوف کے احوال وغیرہ اور دیگر امور جنہیں کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اسی طرح سے سحر اور کہانت والے

لوگ، سیدنا محمد ﷺ کے عہدِ مبارک سے پہلے غیبی امور کو جانتے تھے کیونکہ جن جنات کو وہ اور ادو منتروں کے ذریعہ مسخر کرتے تھے ملا اعلیٰ سے سن گن چراتے تھے اور اضافہ کے ساتھ انہیں آ کر بتاتے تھے جیسے حکایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے شق و سطیح دو کاہن تھے اور وہ آپ ﷺ کے عہد مبارک سے پہلے آپ کے ظہور کی بشارت سنایا کرتے تھے یہاں تک کہ اس کے بارے میں کسریٰ نے ان سے پوچھا اور وہ اس خبر کو سن کر دہل گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے غیوبات اکثر لوگ جانتے تھے۔ اور قرآن پاک اس قسم کی غیب دانی کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔ پس ابوحیان اندلسی اور شوکانی اور ان کے متبعین نے اس قسم کے غیب کے حصول کو محال سمجھا ہے اور اس کا انکار کیا ہے، وہ ان کی کم علمی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ان دونوں کی طرف سے امام رازی کا رد کرنا ان دونوں کی شدید لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔ **فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا** (ترجمہ:۔ تو بے شک وہ اس کے آگے اور پیچھے دو نگہبان مقرر فرما دیتا ہے۔ یعنی محافظ۔ معنی یہ ہیں کہ جب اللہ کسی رسول کو اپنے غیب پر مطلع کرتا ہے اور اسے اس کی طرف وحی کرتا ہے تو اس وحی کے حامل فرشتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ دوسرے محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے۔ جو جنات و شیاطین سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ اس فرشتے کے آگے اور پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اور اس وحی کو بغیر زیادتی اور نقص کے اس رسول پر القاء کرتے ہیں۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔

(۲۸) **لِّيَعْلَمَ** (ترجمہ:۔ تا کہ ظاہر فرما دے) اس میں لام "یسلک" سے متعلق ہے اور یہاں پر اس سے مراد اس پہونچانے سے متعلق علم ہے۔ **اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ** (ترجمہ:۔ کہ بے شک ان سب نے اپنے رب کے پیغام پہونچائے) یہ ان مخففہ ہے ثقیلہ سے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے اور یہ بھی قول ہے کہ ابلغوا میں ضمیر رصد کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی محافظ۔ زجاج کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں تا کہ اللہ ظاہر فرمائے کہ اس کے رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہونچا دئے امام رازی فرماتے ہیں الا من ارتضیٰ من رسول، لفظ رسول واحد لایا گیا اور پھر ان قد ابلغوا میں اسے جمع لایا گیا۔ اور اس کی مثال ایسی ہے کہ جو کہ فان له نا ر جهنم خالدين میں ہی گذر چکی ہے۔ یہ اس لئے کہ من ارتضیٰ میں لفظ من معنی عموم میں ہے۔ اور اس سے جمع مراد لینا صحیح ہے۔ **وَاَحَاطَ** (ترجمہ:۔ اس نے احاطہ فرمالیا) یعنی اللہ نے۔ **بِمَا لَدَيْهِمْ** (ترجمہ:۔ اس کا جو ان کے پاس ہے) یعنی حفاظت کرنے والے فرشتوں کے پاس۔ **وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا** (ترجمہ:۔ اور اس سے ہر چیز کی گنتی کو پورا کر لیا ہے) اور یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ جل شانہ جزیات کا (علی وجه الجزیٰ) بہ اعتبار جزی جاننے والا ہے۔